سمندر خاں سمندر، سید رسول رسا، فضل حق شیدا، عبدالغنی خاں غنی، امیر حمزہ خاں شنواری اور ولی محمد طوفان کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان شعرا کے ابتدائی زمانے میں سکولوں اور کالجوں میں پشتو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ صرف گھروں یا مسجدوں میں اس کی تھوڑی بہت نوشت و خواند ہوتی تھی لیکن ہمارے یہ شاعر فارسی، عربی، اردو، اور بعض انگریزی سے شناسا ہونے کے سبب ان زبانوں کے ادب سے واقف تھے اور انھوں نے اپنے سے قبل کے دور کی پشتو کی بے پایاں شاعری کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ خوشحال خاں خٹک، رحمان بابا، علامہ اقبال اور غنی سے کافی متاثر تھے۔ ان میں سے جو کم عمر تھے، ان کے سینوں میں جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری نے بھی انقلاب اور بغاوت کی چنگاریاں سلگائی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے پہلے پہل قومی تحریکوں میں جوش اور جذبہ پیدا کیا اور ... زندگی کا احساس بھی پیش کیا۔ انھوں نے اسلام کی بنیادی قدریں پیش کیں اور مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی سے آگاہ کیا کہ ان میں اپنا مستقبل بہتر و خوشتر بنانے کے لیے ... لینے کا شوق اور جذبہ پیدا کیا۔ ان ادیبوں میں سے اب جو بقید حیات ہیں ان کو پشتو ادب میں اساتذہ کا مقام حاصل ہے۔

امیر حمزہ خاں شنواری آزادی سے قبل اور بعد کے شاعروں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ وہ بہترین غزل گو شاعر ہے اور نوجوان شعرا کا ایک طبقہ اس سے متاثر اور تلمذ رکھتا ہے۔ حمزہ شنواری خوشحال خاں خٹک، رحمان بابا اور علامہ اقبال تینوں سے خاصا متاثر ہے۔ وہ اگر ایک طرف متصوف اور عاشق مزاج ہے تو دوسری طرف قومی اور مذہبی شاعر کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس کی شاعری میں پشتون مزاج کی ترجمانی بھی نمایاں ہے۔

مذکورہ بالا بزرگ شعرا میں سمندر خاں سمندر جو ایک کہنہ مشق اور پختہ کار ادیب ہے، اسلام، قوم اور وطن کا شیدائی ہے۔ وہ ایک طرف خوشحال خاں اور علامہ اقبال سے متاثر ہے اور دوسری طرف مذہبی علما اور اولیا سے۔ وہ اچھا نثر نگار بھی ہے اور نظم و نثر کی متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔

فضل حق شیدا اور رسول رسا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب زیادہ متنوع شاعر ہیں۔ قدیم اور جدید ادب دونوں کے نمائندے ہیں۔ اگر ایک طرف ملیت و حریت کے پرستار ہیں تو دوسری طرف معاشرتی انقلاب کے داعی و پرستار بھی ہیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ معاشرے

کی بدعنوانیوں پر خصوصیت کے ساتھ تنقید کی ہے۔ انھوں نے اپنی زبان شعر سے متعدد اعاظم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و رومان بھی ہے۔ دُکھ درد بھی ہے اور امید و آرزو بھی ہے۔ دونوں خوش حال خاں اور اقبال سے متاثر ہیں۔ انھوں نے پشتون ماحول کی عکاسی بھی کی ہے اور دوسرے نوجوان شاعروں کو متاثر بھی کیا ہے۔ شیدا کی منظومات کا ایک مجموعہ امویلی (آہیں) دو تین سال ہوئے شائع ہوا۔ رسول رسا کے اشعار کا مجموعہ بھی عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ ان نے متعدد ناول بھی لکھے ہیں۔

عبدالغنی خاں غنی اور عبدالاکبر خاں اکبر نے آزادی سے قبل اپنی قومی اور انقلابی شاعری سے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ دونوں اچھے فن کار ہیں اور پشتو کے نوجوان ادیب ان کے فن کے مداح و معترف ہیں۔ غنی خاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ انگریزی ادبیات سے اب زیادہ متاثر دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی نثر بھی خوب لکھ لیتا ہے اور کبھی کبھی اس زبان غیر میں طبع آزمائی بھی کرتا ہے۔ مزاح کا اچھا ملکہ رکھتا ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں اس کا مزاحیہ انداز دل چسپ اور دل آویز ہے۔

نئے ادیب

قیام پاکستان کے بعد پشتو ادب کے آسمان پر جو نئے ستارے طلوع ہوئے ہیں ان میں اجمل خٹک زیادہ چمکا ہے۔ اجمل شاعر، افسانہ نگار، مقالہ نگار اور مزاحیہ نگار ہونے کے علاوہ ذوق تنقید بھی رکھتا ہے۔ زیادہ تر خوش حال خاں خٹک سے متاثر ہے۔ اردو ادب کا مطالعہ بھی رکھتا ہے۔ اس کی شاعری اور دیگر تحریروں کا مرکزی نقطہ پشتون ثقافت اور اسلامی معاشرت ہے۔ اس نے پشتو شاعروں کی نئی پود کو کافی متاثر کیا ہے۔

پشتون کے نوجوان شاعروں میں اشرف مفتون رومانی شاعر ہے۔ وہ جدید ادب سے کافی متاثر ہے اور شاعری میں پرانی روایات کا زیادہ قائل و پابند نہیں ہے۔ اس نے اردو کی جدید شاعری سے پشتو کی ہیئت و ترکیب میں کچھ استفادہ کیا ہے اور پشتو شاعری کو نئے نئے تجربات سے روشناس کرنے کی طرف مائل ہے۔ اس کے دو شعری مجموعے "د شاعر دنیا" (شاعر کی دنیا) اور "سڑیکے" (ٹھیسیں) شہرت پا چکے ہیں۔

نوجوان شعراء میں یونس خلیل اپنا ایک الگ اور مخصوص طرز رکھتا ہے۔ اس کے کلام میں وجدان

رومان کی فراوانی ہے۔ وہ ایک طرف اگر انگریزی ادب کے لطیف و بلند تخیل سے متاثر معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی وجدانی رومانیت کی پاکیزگی، حیاداری، معصومیت، پاک دامنی اور ایک خاص قسم کی روحانیت آمیز وجدانی کیفیت غیور و باحیا پشتون ماحول کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ یونس کے اشعار (جو زیادہ تر قطعات کی صورت میں ہیں) وجد آور اور سحر انگیز ہیں جن کو پڑھتے وقت حیات و کائنات کا ذرہ ذرہ نہایت پیارا اور دل کش معلوم ہوتا ہے۔ یونس خلیل کا ایک چھوٹا سا شعری مجموعہ "لالہ زار" عرصہ ہوا طبع ہو چکا ہے۔ پشتو کے رسائل و اخبارات میں اس کی جو منظومات نظر آتی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب اس میں تنوع بھی آ رہا ہے۔ وہ اب قومی اور ملی شاعری بھی کرنے لگا ہے۔

مذکورہ زمرے کے شاعروں میں صاحب زادہ فیضی اعلیٰ پائے کا ایک اور رومانی شاعر ہے جس کے کلام میں جدت و ندرت کے ساتھ تخیل کی بلندی بھی پائی جاتی ہے۔ ایک خاص اسلوب کا مالک ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔

پشتو کے دوسرے بہت سے نوجوان شاعر بھی رومانی شعر کہتے ہیں لیکن یہ نرے رومانیت پسند بھی نہیں۔ ان کے کلام میں حقیقت پسندی کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ قمر راہی، عبداللہ جان مغموم، روغ لیونے، لطیف وہبی، محمد دین مقید، زیتون بانو، فوزیہ انجم وغیرہ کو ان میں خصوصیت حاصل ہے۔ داؤد کرّم کا واحد شاعر تقی شراب ہاشمی رومانیت پسند بھی ہے اور فیلسوف بھی۔

نوجوان شاعروں میں سے بعض نے پشتو میں آزاد معرّا شاعری کے تجربات بھی شروع کیے ہیں۔ ان میں قلندر مومند، یونس خلیل، ایوب صابر، محمد ہاشم بابر، عمل خان سیاح، تقی شراب ہاشمی، سلیم راز، اور فوزیہ انجم وغیرہ شامل ہیں۔ آزاد اور معرّا شاعری کے کچھ نمونے غنی خان غنی کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ یہ شاعر وسیع المطالعہ ہیں۔ خیالات کی وسعت اور بلندی رکھتے ہیں اس لیے ان کے اشعار اعلیٰ اور شیریں تخیل کے حامل ہوتے ہیں۔

جدید غزل گو شاعروں میں حمزہ شنواری، قلندر مومند، سیف الرحمٰن سلیم، لطیف وہبی، قمر راہی، خاطر آفریدی، اشرف مفتون، لعل زادہ ناظر، اور رب نواز مائل وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض میں ترقی پسند رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ قلندر مومند اور ایوب صابر ترقی پسند شاعروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ تاہم تمام پشتون شاعروں کی طرح ان کے کلام میں بھی قومی اور ملی جذبات کی فراوانی ہے اور ان

میں سے کوئی بھی سنجیدگی اور متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ان کے بعض اشعار میں مزاح کی چاشنی ضرور ہوتی ہے لیکن ان میں ایک وقار اور پیار ہوتا ہے۔

پشتو غزل کو خوشحال خان خٹک، رحمان بابا اور عبدالحمید مہمند کے دور سے جو ترقی حاصل ہوئی ہے، وہ روز افزوں ہے۔ غزل میں فقط عشق و محبت ہی کی باتیں نہیں ہوتیں، زندگی کے دوسرے حقائق و مسائل بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ نظم، رباعیات، قطعات، مسدس، مخمس، معشر، وغیرہ کے علاوہ چاربیتے، ٹپے، ٹنگی اور دیگر پشتو اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی عام ہے۔

ملی ترانے

پشتو کی شاعری میں حب الوطنی کا جذبہ شروع ہی سے بہت زیادہ نمایاں ہے۔ پشتو کی شاعری بقول علامہ اقبال "مارشل شاعری" ہے۔ پشتون شعراء امن کے ایام میں بھی رزم و جہاد اور شجاعت و تہور پر مبنی اشعار کہتے رہتے ہیں اور پشتو شاعری ویسے بھی تلواروں کی جھنکار، توپوں کی گھن گرج اور بندوقوں کی ٹک ٹوں اور بموں کے دھماکے معلوم ہوتی ہے لیکن جب واقعی رزم و جہاد کا موقع ہو تو پشتو شاعری سرتاپا میدانِ جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پشتو شاعری دورانِ جنگ ہی میں اپنے اصل محل وقوع میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر اچانک حملہ کر دیا تو ایک طرف ہزاروں پشتون مجاہدین نے رضاکارانہ طور پر بندوقیں اٹھا کر دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کی غرض سے مختلف محاذوں کی جانب مارچ شروع کیا اور دوسری طرف پشتو کے شاعروں نے خوشحال خان خٹک کی وہ زبان اختیار کی جس کی تعریف میں وہ خود یوں گویا ہے:

"میری زبان نہیں آگ ہے جو بندوق کی گولیوں کی طرح نشانہ لگاتی ہے۔"

جن لوگوں نے ایام جنگ میں پشاور اور کوئٹہ کے ریڈیو سٹیشن باقاعدگی اور اہتمام سے سنے ہوں اور پشتو کے رسائل و اخبارات کا مطالعہ کیا ہو، وہ آپ کو بتا دیں گے کہ پشتو کے شاعروں اور ادیبوں نے پشتونوں کے دلوں میں دشمن کا مقابلہ کرنے اور وطن مقدس کے ایک ایک انچ کی خاطر کٹ مرنے کا کتنا جذبہ اور جوش پیدا کیا۔ بعض شاعروں نے تو اتنی رزمیہ منظومات کہیں کہ فرداً فرداً ہر ایک کے کلام کا مجموعہ چھپ سکتا ہے۔ چنانچہ کئی ایک کے جنگی ترانوں کے بہت اچھے مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ ان میں عبدالواحد ٹھیکیدار کا "میدانِ جنگ"، جمشید شاعر کا "د پاکستان غزا"،

جو حاجی گل صوفی کا مزاحیہ، شجاعت و مردانگی) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ادارۂ نشر و اشاعت قبائل یونٹ کی طرف سے غورزنگونہ (چھیڑ چھاڑ کا مقابلہ کرنا) رزمیہ منظومات کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں پشتو کے متعدد نامی گرامی شعراء کے جنگی منظومات اور ترانے شامل ہیں۔

پشتو رسائل

موجودہ دور میں کسی زبان کی ادبی وسعت اور کیفیت و کمیت کا صحیح اندازہ صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب ادیبوں کو اپنے شہ پاروں کی طباعت و اشاعت کی عام سہولتیں حاصل ہوں۔ پشتو زبان اس اعتبار سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہے۔ پشتون علاقوں میں چونکہ ذریعہ تعلیم شروع سے اردو ہے اس لیے لوگ اردو میں مطالعے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ پشتو بولنے والے علاقے محدود ہیں اور پشتو پشتونوں کے سوا دوسرے لوگ نہیں سمجھتے اس لیے پشتو کی کتابوں اور رسائل و اخبارات کی اشاعت کاروبار نفع بخش نہیں ہے۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد پشتو ادب کی طباعت و اشاعت میں ترقی ہوئی ہے۔ پشتو زبان کے متعدد رسالے اور مجلے معرض وجود میں آئے اور ان کا معیار بھی بہت اچھا تھا لیکن یہ مختصر عرصہ تک جاری رہنے کے بعد مالی دشواریوں کے باعث بند ہوتے رہے۔ پشتو کے رسالے پشتو کے ادیبوں کے لیے وہی حیثیت رکھتے رہے ہیں جو مچھلی کے لیے تالاب کی ہوتی ہے جب کبھی پشتو کا کوئی رسالہ نکلا، ادیب اس میں تیرتے نظر آئے۔ انھوں نے ادب کی ہر صنف پر قلم اٹھایا اور وہ سب کچھ لکھا جو ایک زندہ اور توانا زبان کے ادیبوں کو لکھنا چاہیے مگر پھر ایسا وقت آ جاتا ہے جب پشتو کا کوئی ادبی رسالہ نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اردو کے اخبارات پشتو کے لیے جگہ مخصوص رکھتے ہیں اور پشتو کے ادیب اس کو غنیمت سمجھنے لگتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو کا پہلا ماہوار رسالہ "اسلم" کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر مشہور ادیب صنوبر حسین خان مومند (مرحوم) تھے۔ اس رسالے میں زیادہ تر ترقی پسندانہ اور انقلابی نوعیت کی تحریریں چھپتی تھیں جو معیاری ہوتی تھیں۔ رحمان بابا کو تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کا سہرا اسی رسالے کے سر ہے جس کا ایک معیاری ایڈیشن "رحمان بابا نمبر" نکلا۔ اس میں بلند پایہ ادیبوں نے رحمان بابا کی شخصیت، شاعری، فکر و نظر، ادبی پس منظر اور ماحول پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی۔ یہ رحمان بابا پر تحقیق اور تنقید کا اولین بڑا کارنامہ تھا۔ تاہم "اسلم" زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔

اس کے بعد متعدد دیگر رسائل نکلے جن میں انصاف، رہبر، لار، دوران، جمہوریت، ژوند، خپلواک اور قند د مردان نے پشتو ادب کی حسب توفیق خدمت کی مگر یہ رسالے بھی مالی دشواریوں کے سبب زیادہ دیر نہ چل سکے۔ ان میں "دوران" "پشاور اور" "قند" مردان نے پشتو ادب کی خوب خوب خدمت کی 'دوران' نے ایک اچھا خاصا 'رحمان بابا نمبر' بھی نکالا۔ 'قند' مردان اگرچہ اردو، پشتو اور انگریزی کا سہ لسانی رسالہ تھا جو پریمیئر شوگر ملز مردان کی سرپرستی میں نکلتا تھا مگر اس نے پشتو ادب کی مختلف اصناف مثلاً غزل، افسانہ اور ڈرامہ کے الگ مخیم نمبر نکالے جو اب پشتو ادب پر کام کرنے والوں کے لیے لائبریری کی مطالعاتی اور حوالہ جاتی کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالآخر یہ رسالہ بھی بند ہوگیا۔ البتہ پشتو کے تین سرکاری رسالے کافی عرصہ سے نہایت استقلال کے ساتھ جاری ہیں۔ ان میں دو رسالے "جمہور اسلام" پشاور، اور "اولس" کوئٹہ محکمہ نشر و اشاعت قبائل کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں، اور "اباسین" کراچی۔ حکومت پاکستان کے شعبہ مطبوعات کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ یہ تینوں خاصے معیاری رسالے ہیں۔ ان کے لکھنے والوں کو معاوضہ بھی ملتا ہے اور ان میں من جملہ معاشرتی، معاشی اور ثقافتی و معلوماتی مضامین کے ادبی مضامین اور منظومات بھی شائع ہوتی ہیں۔ یہ رسالے نہ صرف پشتونوں میں ایک نیا صحت مند قومی اور ملی شعور پیدا کرنے کا قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں بلکہ پشتو علم و ادب کی خدمت اور حوصلہ افزائی بھی کر رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو ادب کی ترقی کا ایک اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سابق صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں پشتو کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک معقول تعداد پیدا ہوگئی ہے۔ کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع نسبتاً پس ماندہ اضلاع ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں پشتو کے ادیب خال خال تھے۔ پشتو کے قدیم بڑے شاعروں میں خواجہ محمد بنگش کا پتہ چلتا ہے یا درہ کوہاٹ کے قاسم علی خاں آفریدی تھے جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ہندوستان کے شہر فرخ آباد میں گزارا۔ آفریدی پشتو اور اردو دونوں کا صاحب دیوان شاعر تھا۔ کوہاٹ اردو ادب کا ویسے بھی مرکز ہے اور وہاں اردو کے اچھے ادیب موجود ہیں۔ لیکن قارئین المعارف کے لیے غالباً یہ بات معلومات افزا ہوگی کہ گزشتہ چند سال میں ضلع کوہاٹ نے تین آدم جی ادبی انعامات حاصل کیے ہیں۔ تینوں انعام یافتہ ادیب کوہاٹ کے اصل باشندے ہیں۔ ان میں ایک انعام احمد فراز کو ان کے شعری مجموعے پر ملا ہے۔ اس

گزارش کا مقصد یہ تھا کہ یہ علاقہ ادب کے لیے تو بڑا زرخیز ہے لیکن عام سہولتیں نہ ہونے کے سبب ادیبوں کو ابھرنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ اب جب قیام پاکستان کے بعد علم و ادب کی قدردانی اور حوصلہ افزائی ہونے لگی ہے تو پشتو ادب نے بھی ترقی کی۔ اس وقت کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع میں پشتو کے بہت سے ادیب ہیں جو اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ان میں ایوب صابر، جعفر حسین، عمل خاں سیاح، پریشان خٹک، علی احمد جان فدا، نواب زادہ صبح صادق خاں، طاہر کلاچوی، آثاری گل آثار، مطیع اللہ قریشی، مجبور سورانی، لائق شاہ درپہ خیل، رشید علی دہقان سب پشتو نظم و نثر میں طاق ہیں۔ بعض کے بہت اچھے شعری مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں طاہر کلاچوی، مطیع اللہ قریشی اور آثاری گل آثار کے مجموعے راقم الحروف کے مطالعے میں آئے ہیں۔ ان علاقوں میں پشتو کی ادبی انجمنیں بھی کام کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے قبائلی علاقوں میں پشتو کے بہت اچھے شاعر اور نثر نگار موجود ہیں جن میں سے متعدد کے شعری مجموعے چھپ گئے ہیں۔ مشہور غزل گو شاعر امیر حمزہ خاں شنواری خود قبائلی بزرگ ہیں جو درۂ خیبر کے لنڈی کوتل میں رہائش رکھتے ہیں۔ ان کے ایک فرزند مراد علی خاں شنواری پشتو کے اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ طوالت کے خوف سے باقی قبائلی شعراء کا ذکر چھوڑا جاتا ہے ورنہ قبائلی علاقوں میں اتنے زیادہ شاعر ہیں کہ مراد شنواری کو 'خیبر شاعران' (خیبر کے شاعر) ایک کتاب لکھنی پڑی۔

کوئٹہ

سابق بلوچستان کا کوئٹہ ڈویژن پشتونوں کا علاقہ ہے جہاں پشتو کے کئی نامور شاعر گزرے ہیں۔ ان میں پیر محمد کاکڑ اور ملا عبدالسلام کا کلام بلند پایہ ہے۔ تاہم زیادہ پس ماندہ ہونے کے سبب یہ علاقہ غیر علمی اور غیر ادبی ماحول رکھتا آیا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے وہاں پشتو کی نوشت و خواند برائے نام سی تھی بلکہ اس علاقے میں تو پاکستان سے قبل اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام بھی نہ ہونے کے برابر تھا ورنہ اردو فارسی اور عربی کا ہر خواندہ پشتون اپنی مادری زبان کی نوشت و خواند میں از خود طاق ہو سکتا ہے۔ ہمارے ماضی قریب میں کوئٹہ کے علاقے میں علامہ عبدالعلی خاں (مرحوم) کو پشتو ادب اور قومی خدمات کے ضمن میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ کے علاقے میں جہاں عام خواندگی کی ترقی کی طرف توجہ دی گئی وہاں پشتو زبان کی قسمت بھی جاگ اٹھی اور اس کا سہرا ہماری حکومت کے سر ہے۔ وہاں پبلسٹی کا شعبہ کھلنے کے بعد

پشتو میں پبلسٹی کی ضرورت کے پیش نظر پشتو کے مختلف پمفلٹ اور مطبوعات لکھے پڑھے لوگوں میں تقسیم کیے گئے جن کی بدولت وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنی زبان میں نوشت وخواند کا علم و احساس ہوگیا اور رفتہ رفتہ لکھے پڑھے پشتون نوجوانوں کو اپنی مادری زبان میں پڑھنے لکھنے کا شوق دامنگیر ہوگیا۔ ادب سے شغف رکھنے والوں نے پشتو میں کہنا اور لکھنا بھی شروع کیا۔ پھر چند نوجوانوں نے مل کر "پشتو" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا۔ یہ رسالہ کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ کوئٹہ کے ایک مشہور ادیب فضل احمد غازی نے "گلستان" نامی پشتو کا ایک ہوار ادبی رسالہ جاری کیا۔ یہ بھی کچھ مدت کے بعد بند ہوگیا لیکن ان دو رسالوں کی بدولت پشتو ادب سے دلچسپی میں اضافہ ضرور ہوگیا اور پشتو صحافت کا سلسلہ چل نکلا۔ چنانچہ ایک اور نوجوان ظفر اللہ خان نے "ظفر الاسلام" کے نام سے پشتو کے ایک رسالے کا اجرا کیا۔ پشتو کا ایک ہفتہ وار اخبار "هیواد" (وطن) بھی جاری ہوا۔ دریں اثنا اس علاقے میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ ایک تھا ریڈیو سٹیشن کے قیام کا واقعہ اور دوسرا محکمۂ نشر و اشاعت قبائل کے قیام کا۔ ریڈیو سٹیشن سے پشتو کا پروگرام شروع ہوا جس سے کوئٹہ کے علاقے میں پشتو نوشت وخواند کے سلسلے کو ترقی حاصل ہونے لگی۔ قبائلی نشر و اشاعت کے ادارے نے پشتو کا ایک ماہوار مجلہ "اولس" (عوام) جاری کیا۔ یہ معیاری رسالہ کافی عرصے سے جاری ہے جس میں پشتو کے ادیبوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع مل رہا ہے۔ اولس میں پشتو ادبیات کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور ہر سال اس کے چند مخصوص نمبر بھی نکلتے ہیں جو ہر اعتبار سے معیاری اور علم افزا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض نمبروں کو مستند تاریخی اور ادبی کتابوں کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس رسالے کے ذریعے ہمیں پہلی بار سابق بلوچستان کے متعلق ہر قسم کی مفصل و مکمل معلومات حاصل ہوگئیں۔ مذکورہ ادارہ پشتو کی دیگر مطبوعات بھی شائع کرتا رہتا ہے۔ اب کوئٹہ کے علاقے میں پشتو کے شاعروں اور ادیبوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ان میں سلطان محمد صابر، عبدالصمد درانی، فضل احمد غازی، رب نواز مائل، نذیر درانی، سعید گوہر، مولوی عبدالخالق تارنڑ، سید محمد رسول فریادی، منتظر بٹنی اور ایسے ہی متعدد دوسرے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی تحریریں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں اور اب کوئٹہ کے علاقے میں پشتو ادب کا چراغ فروزاں سے فروزاں تر ہوتا جا رہا ہے۔

قیام پاکستان سے بعد پشتو علم و ادب کے میدان میں بعض کارنامے ملی ثقافت کی ترقی کے ضمن

میں بہت اہم ہیں۔ خوش حال خان خٹک، رحمان بابا اور علامہ اقبال ہماری ملی ثقافت کے عظیم علم بردار اور ہمارے قومی جذبات کے بہت بڑے ترجمان تھے۔ خوش حال و رحمان کو پشتون اور غیر پشتون پاکستانیوں کے سامنے وضاحت کے ساتھ پیش کرنا اور علامہ اقبال کو پشتونوں کے اور زیادہ قریب لے آنا نہایت ضروری تھا۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال پر اردو میں بہت کام ہوا ہے اور تعلیم یافتہ پشتون اردو اور فارسی سے واقف بھی ہیں لیکن علامہ اقبال کو پشتو میں سمجھنا اور ان کے کلام کو پشتو میں منتقل کرنا اس لیے بھی بہت ضروری تھا کہ علامہ اقبال کی شاعری اور تعلیمات کی روح پشتو کی شاعری اور پشتو جاننے والوں کے قریب تر تھی۔ علامہ اقبال نے خود پشتو نہ جاننے پر اظہار افسوس کیا تھا جیسا کہ وہ جالندھر کے پٹھان عالم اور رئیس اعظم جناب نیاز الدین خاں (مرحوم) کو ۱۹۱۹ میں تحریر فرماتے ہیں:

"افسوس کہ مجھے پشتو نہیں آتی ورنہ میں سرحد کی مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہناتا۔"

علامہ اقبال کے طالب علموں سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ انھیں ملت افاغنہ سے بہت زیادہ محبت تھی اس لیے ان کے پیغام اور تعلیمات کو سمجھنے اور اپنے اندر جذب کرنے کا فریضہ پشتونوں پر زیادہ عائد ہوتا تھا۔ علامہ اقبال کی پشتونوں سے بے پناہ محبت رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی اور اب ان کا بیشتر فارسی اور اردو کلام پشتو میں منظوم ہو چکا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس نیک کام کا آغاز پشتو کے مشہور بزرگ شاعر سمندر خان سمندر نے حکومت کے ایما پر کیا تھا۔ بعد میں بزم اقبال کی امداد و اعانت سے یہ کام پشتو اکاڈیمی نے انجام دینا شروع کیا۔ اس عظیم الشان کام پر پشتو زبان اور پشتون قوم جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

پشتو اکاڈیمی نے خوش حال خان خٹک کے بیشتر کلام کو اردو ترجمے کے ساتھ شائع کرنے کے علاوہ مسز اولف کیرو اور مسٹر الون ہاول کی انگریزی کتاب Poems of Khushal Khan Khattek بھی شائع کی ہے۔ خوش حال خان خٹک کے سلسلے میں جو دوسرے کام ہوئے ہیں ان میں دوست محمد خان کامل مومند کی اردو تصنیف "خوش حال خان خٹک" نہایت معرکے کی کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ خوش حال خان کے مستند حالات زندگی تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کے علاوہ اشعار خوش حال کے چیدہ چیدہ نمونے بھی ترجمہ کے ساتھ دیے ہیں۔ راقم الحروف

کی اردو کتاب "خوش حال و اقبال" بھی اس سلسلہ میں ایک حقیر سعی ہے۔ جس کے عوض اسے آدم جی انعام بھی ملا ہے اور اباسین آرٹ کونسل کا انعام بھی حاصل ہوا ہے۔ راقم الحروف کی ایک اور اردو کتاب "رحمان بابا شاعرِ انسانیت" اس سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ پشتو کے مشہور غزل گو شاعر امیر حمزہ خاں شنواری نے رحمان بابا کا دیوان اردو میں منظوم کیا جسے پشتو اکاڈیمی شائع کر چکی ہے۔ دوست محمد خاں کامل مومند نے پشتو میں رحمان بابا پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے۔ علامہ اقبال پر پشتو میں جو کام ہوئے ہیں ان میں عبدالرحمان بے تاب کی ایک چھوٹی سی کتاب خاصی اچھی ہے۔ اس میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے علاوہ ان کے افکار و نظریات پر بھی بحث کی گئی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد پشتو ادب کو اردو میں پہلی بار پیش کرنے کا سہرا پشاور کے دو معروف ادیبوں رضا ہمدانی اور فارغ بخاری کے سر ہے جنھوں نے "تاریخ ادبیاتِ سرحد" میں پشتو کے پرانے تمام مشہور شاعروں کے حالات اور کلام کے نمونے اردو ترجمہ کے ساتھ قلم بند کر کے پشتو ادب کی وسعتوں اور بلندیوں سے اہلِ پاکستان کو آگاہ کیا۔ انھوں نے پشتو کے بعض شعرا کے کلام کے چیدہ چیدہ نمونے بھی اردو میں منظوم کیے ہیں۔ فارغ بخاری صاحب نے پشتو کی رومانی داستانوں پر بھی اردو میں ایک کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے سابق 'سنگ میل' پشاور (اردو) کے ذریعے بھی پشتو ادب کی خدمت کی۔ 'سنگ میل' اردو کا ایک معیاری اور ترقی پسند رسالہ تھا جس میں پشتو ادب پر معیاری مضامین شائع ہوتے تھے۔

خوش حال خاں خٹک پر پشتو میں جو متعدد کام ہوئے ہیں ان میں "ارمغانِ خوش حال" مرتبہ سید رسول رسا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ یہ کوئی بارہ صد صفحات پر مشتمل بڑی تقطیع کی ضخیم کتاب ہے جس میں خوش حال بابا کا قریب قریب تمام کلام یک جا کیا گیا ہے۔ علاقۂ پشاور میں پہلے صرف خوش حال خاں خٹک کی کتاب کلیات مطبوعہ صورت میں دست یاب ہوتی تھی۔ اگرچہ دوست محمد خاں کامل نے کلیاتِ خوش حال خاں کو از سرِ نو مرتب کر کے ایک محققانہ دیباچے کے ساتھ اسے طبع کرایا تھا اور پشتو اکاڈیمی کی مطبوعہ (اردو ترجمہ کے ساتھ) کتاب خوش حال خاں میں کلیات کے علاوہ اور کلام بھی شامل کیا گیا تھا مگر 'ارمغانِ خوش حال' میں باز نامہ، سوات نامہ اور فضل نامہ کے علاوہ خوش حال خاں کے کچھ مزید کلام کو بھی اس میں یک جا کر کے پیش کیا گیا۔ فاضل مرتب سید رسول رسا

نے اس پر پشتو میں کوئی ڈیڑھ سو صفحات کا پُر مغز دیباچہ بھی لکھا ہے۔

اہم مطبوعات

پشتو ادب کی دیگر اصناف کی بست سالہ رفتار ترقی کا مختصر جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کاموں کا مختصر ذکر کیا جائے جو پشتو ادب کے سلسلے میں پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکاڈیمی نے انجام دیے ہیں۔ مذکورہ اکاڈیمی کا قیام آج سے کوئی ۱۴ برس قبل ہوا تھا۔ اس کے بانی ڈائرکٹر مولانا عبدالقادر خاں ایک جانی پہچانی علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ پشتو اکاڈیمی نے ان کی رہنمائی میں پشتو کے پرانے ادیبوں کے شعری مجموعے اور دیگر کام شائع کرنے کے علاوہ بعض ایسے شعراء کے دیوان بھی چھاپے جو معدوم اور نامعلوم تھے۔ مولانا عبدالقادر خاں نے پشتو کے قدیم آثار کی تلاش میں یورپین ممالک کے سفر بھی اختیار کیے اور وہاں کی لائبریریوں سے بعض قیمتی علمی و ادبی آثار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں روشنائی تحریک کے مشہور بانی بایزید انصاری کی کتاب خیرالبیان بھی شامل ہے۔ مصری خاں گگیانی کا دیوان اکاڈیمی کی بالکل نئی دریافت ہے۔ اس دیوان کے ذریعے مصری خاں گگیانی کے حالاتِ زندگی کا بھی پتہ چلا۔ مصری خاں نے پشتو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اکاڈیمی نے اس کا جو دیوان چھاپا ہے اس میں ایک اردو غزل بھی ہے جو اس زمانے کے اعتبار سے خاصی معیاری ہے اور بالکل ٹھیٹھ زبان میں ہے۔ یاد رہے کہ مصری خاں گگیانی رحمان بابا کے قریبی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ قریباً اسی دور کے ایک اور پشتو شاعر معز اللہ خاں مہمند کا دیوان بھی اکاڈیمی نے پیدا کرکے شائع کیا۔ معز اللہ خاں مہمند نے بھی پشتو فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں خوب شاعری کی ہے۔ اکاڈیمی نے مہمند کی اردو شاعری کو ایک الگ کتابچے کی شکل میں بھی شائع کیا ہے۔ پشتو اکاڈیمی نے دیوان احمد شاہ ابدالی، دیوان عبدالحمید مہمند، دیوان علی خاں وغیرہ کے علاوہ خوشحال خاں خٹک کے فرزند عبدالقادر خاں خٹک کا گل دستہ بھی شائع کیا ہے۔ گل دستہ گلستانِ سعدی کا پشتو ترجمہ ہے۔ اکاڈیمی کے زیر اہتمام جو اور بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن میں قاضی عبدالحلیم اثر کی مرتبہ کتاب "بیر پیتر شاعران دبھوے بسرے شاعر" کے علاوہ طالب رشید کی منظوم کردہ یونانی رومانی داستان "گل صنوبر" بھی شائع کی ہے۔ یہ داستان فارسی سے پشتو میں ۱۱۰۴ھ میں منظوم ہوئی ہے۔

اکاڈیمی نے علامہ امتیاز علی خاں عرشی رام پوری کی اردو کتاب "اردو پر پشتو کے اثرات" کے علاوہ پشتو کی جو اور کتابیں بھی شائع کی ہیں ان میں "د مرو تو کسر تو نہ" نامی کتاب اپنی جدّت و خصوصیت کے اعتبار سے بہت ممتاز اور دلچسپ ہے۔

اکاڈیمی کی طرف سے ایک سہ ماہی مجلہ "پشتو" بھی شائع ہوتا ہے جس میں اعلیٰ پائے کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

نئی کتابیں

قیام پاکستان کے بعد پشتو کی جو دوسری ان گنت کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ نظم و ادب کی ہر شاخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں تنقید و تحقیق کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ڈرامے بھی ہیں اور ناول و قصص کی کتابیں بھی ہیں۔ مزاحیہ تحریروں کی کتابوں کے علاوہ نئے شاعروں کے شعری مجموعے بھی ہیں۔

پشتو میں اردو سے ترجمہ شدہ کتابوں کے ذخیرے میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان میں علامہ شبلی کی الفاروق کا ترجمہ غلام قادر خاں نے کیا ہے۔ پٹھانوں کی تاریخ پر قاضی عطاء اللہ جان (مرحوم) کی "د پختنو تاریخ" کی تین جلدیں قیام پاکستان کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ حال ہی میں اس سلسلے کی ایک ضخیم کتاب "پختانہ د تاریخ پہ رنڑا کے" (پٹھان تاریخ کے آئینے میں) شائع ہوئی ہے جس کے مصنف بہادر شاہ ظفر کاکا خیل ہیں۔ یہ پٹھانوں کی تاریخ کی جامع اور مفصل کتاب ہے جو اس موضوع پر اب تک کی ہر زبان میں لکھی ہوئی کتابوں سے بہتر ہے۔

قاضی عبدالحلیم اثر نے گزشتہ چند سال میں متعدد کتابیں لکھ کر شائع کی ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب "روحانی رابطہ" ہے جو پاکستان کے بہت سے اولیائے کرام اور اصفیائے عظام کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اچھی تحقیقی کتاب ہے جس کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ برصغیر میں اسلامی ثقافت کی داغ بیل ڈالنے اور اسے پروان چڑھانے میں اولیاء اور اصفیاء کا حصہ بادشاہوں اور کشورکشاؤں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہ کتاب اس امر پر بھی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے کہ برصغیر خصوصاً موجودہ پاکستان (بشمول مشرقی پاکستان) کے مسلمانوں نے کیونکر ایک عظیم ملت کی صورت اختیار کی۔ قاضی صاحب موصوف کی دوسری پشتو کتابوں میں جمال الدین افغانی، پاک رسولؐ، سوات (ایک لسانیاتی اور تحقیقاتی جائزہ)، پختانہ مورخین (پٹھان مورخ)

اور "د پشتو ادب" (پشتو کا ادب) بیش بہا کتابیں ہیں۔

حضرت جمال الدین افغانی پر ایک کتاب فضل حق شیدا صاحب نے بھی اردو سے پشتو میں ترجمہ کرکے شائع کروائی ہے۔

امیر حمزہ خان شنواری نظم و نثر دونوں قسم کی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کے علاوہ نثری کتابوں میں "ژوند" (زندگی) اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ یہ پشتو میں حیات و کائنات پر فلسفیانہ انداز میں لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "د خوشحال خان یو شعر" (خوشحال خان کا ایک شعر) ہے جس میں تصوف اور وحدت الوجودیت سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے نثری مجموعے اور دیگر نثری کتابیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔

جناب عبدالرؤف نوشہروی نے بھی پشتو میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے دو "د علم رنڑا" (علم کی روشنی) اور "لارے" سائنس اور علم و حکمت کے امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک کتاب "ښکلی پاکستان" (حسین پاکستان) میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے پندرہ مشہور شہروں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ایک دوسری کتاب "بحر الانوار" میں ۲۰ اولیائے کرام کے حالات درج ہیں۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نوجوان ادیب محمد نواز طائر نے "نالیدلئے سوات" (ان دیکھا سوات) ایک سفری روئیداد یا رپورتاژ لکھ کر پشتو میں سفرناموں اور سیاحت ناموں کے لکھنے کا نیا آغاز کر دیا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد پشتو زبان اور ادب کے ایک مخلص شیدائی نصر اللہ خان نصر (مرحوم) اپنی ذات میں خود ایک انجمن اور ادارہ تھے۔ انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی بے شمار کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پشتو گرامر اور درس و تدریس کی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں خیال بخاری کی پشتو گرامر پر کتاب بہت جامع اور سیر حاصل ہے۔ حال ہی میں حاجی خان میر ہلالی نے "توریالی" (بہادر لوگ) کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب پشتو میں لکھ کر شائع کی ہے۔ اس کتاب میں سابق صوبہ سرحد کے لوگوں کے ماضی قریب (سکھوں اور انگریزوں کی عملداری کے وقت سے) کی تاریخ لکھنے کے لیے وافر مواد فراہم کیا گیا ہے۔ آزادی کی مختلف تحریکات پر تفصیل کے ساتھ بحث

کی گئی ہے اور سابق صوبۂ سرحد کی بہت سی شخصیتوں کے خاکے درج کیے گئے ہیں۔ تورپالی میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے خاندان اور قبیلہ ترین کے مفصل حالات بھی درج کیے گئے ہیں اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کر کے لکھا گیا ہے کہ ضلع ہزارہ کے ترین سرداروں نے سکھوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں اعلیٰ کارنامے انجام دیے ہیں۔

جدید اصناف

پشتو میں ادب کی جدید اصناف مثلاً ڈرامہ، افسانہ اور ناول وغیرہ انگریزی اور اردو سے داخل ہوئی ہیں۔ اگرچہ پشتو میں داستان گوئی اور قصہ خوانی قدیم سے رائج ہے۔ بہت سے رومانی، جنگی اور مہماتی قصے کہانیاں نظم اور نثر میں موجود چلی آتی ہیں جن میں تخلیقی اور ترجمہ دونوں اقسام شامل ہیں جیسے 'آدم ودرخانی'، 'محبوب جلانہ وسلے شہی رسول خاں گل مکئ'، تو پشتو کی اپنی رومانی داستانیں ہیں اور 'قصہ بہرام شہزادہ'، 'گل صنوبر اور شہزادہ سیف الملوک' وغیرہ دوسری زبانوں سے منظوم شدہ ہیں۔ ہمارے اپنے زمانے میں بعض پرانے قصے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً حافظ محمد ادریس (مرحوم) کے "زڑے قصے" (پرانی کہانیاں) اور "وڑے قصے" (چھوٹی کہانیاں)۔

ناول پشتو میں ابھی تک کوئی خاص ترقی نہیں کر سکا ہے۔ بعض حضرات نے اس میدان میں سعی کی ہے اور چند ناول ملتے ہیں۔ صاحب زادہ ادریس کے 'پیغلہ' (دوشیزہ) کو پشتو میں جدید ناول کی اولیں کوشش خیال کیا جاتا ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا سید رسول رسا صاحب نے بھی چند ناول 'شمئ'، 'مفرور'، 'میموئ' اور 'خودکشی' وغیرہ لکھے ہیں۔ شیر محمد خاں صاحب کا ایک ناول 'نوظ' (بیان) بھی چھپ چکا ہے۔ اشرف درانی کے ناول 'زرگے سنرگے' اور چند اور ناول بھی لکھے گئے ہیں۔ تاہم ناول کے میدان میں ابھی پشتو کو اردو کی ہمسری کرنا باقی ہے۔

پشتو میں ڈرامہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے داخل ہوا ہے۔ لیکن سٹیج کے ڈراموں کا وقت تو اب اردو میں بھی گزر گیا ہے۔ پشتو میں فلمی ڈراموں کے لیے فی الحال کوئی گنجائش نہیں۔ تاہم پشتو میں بعض قابلِ قدر ڈرامے لکھے گئے ہیں جو زیادہ تر اصلاحی اور معاشرتی ہیں۔ اسلم خٹک کا ڈرامہ "دوینو جام" (خون کا جام) اگرچہ پاکستان کے قیام سے قبل طبع ہو چکا ہے لیکن ایک اچھا اصلاحی اور معاشرتی ڈرامہ ہونے کی وجہ سے یہ ابھی تک مقبول ہے۔ یہ ڈرامہ پٹھانوں میں قتل کے عام اسباب و محرکات اور اس کے

انسداد کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے سارے کردار خوب ہیں۔ اس موضوع پر اور ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایس۔ اے رحمان مرحوم کا ڈرامہ 'تربور' عرف 'زیبا' خاصا مقبول و مشہور ہے۔ ایس۔ اے رحمان کے دو اور ڈرامے نیمگړی خوب (ادھورا خواب) اور "اور او اوبہ" (آگ اور پانی) بھی اچھے ڈرامے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے لکھنے والوں میں حمزہ شنواری، سمندر خان سمندر، اشرف مفتون محمد اعظم خان اعظم، رضا ھمدی، افضل رضا، عبدالخالق خلیق اور متعدد دوسرے ادیب شامل ہیں۔

پشتو میں افسانے کافی لکھے گئے ہیں۔ اچھے افسانے لکھنے والے موجود ہیں لیکن ادبی رسالوں کے فقدان کے باعث ان کی افسانہ نویسی کی صلاحیتیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم افسانوں کے کچھ مجموعے چھپے ہیں۔ قلندر مومند، نادر خان بزمی، مہدی شاہ مہدی، زیتون بانو اور اشرف حسین احمد کے افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دیگر افسانہ نگاروں میں حمزہ شنواری، مراد شنواری، اجمل خٹک، گل افضل، ڈاکٹر شاہ افضل، ساغر آفریدی، اکمل اسد آبادی، حسن خان سور، یوسف خان اورکزئی، سردار فنا، اور دوسرے متعدد ادیب شامل ہیں۔ یہ افسانہ نگار اردو و انگریزی کے افسانوں سے متاثر ہیں۔ بعض افسانہ نگاروں کے افسانے اپنے معاشرتی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔

پشتونوں میں مزاح کا اچھا اور صحت مند ذوق شروع سے موجود ہے۔ انیسویں صدی کے ایک انگریز سیاح اور مورخ الفنسٹن اور ایک دوسرے انگریز وار برٹن نے پٹھانوں کی صحبت میں کچھ عرصہ گزار کر اس کا احساس و اعتراف کیا ہے۔ پشتونوں کا مزاح راست بازی، بے تکلفی اور خلوص کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ طنز اس کی فطرت اور مزاج کو سخت ناپسند ہے جس میں حسد اور بغض کے تیر و نشتر چھپے ہوتے ہیں۔ پشتو کے متعدد ادیب اچھے مزاح نگار ہیں۔ رسائل و اخبارات میں ان کی مزاحیہ تحریریں چھپتی ہیں اور بعض کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ ان میں "لشے" محمد اعظم خان اعظم کی ایک تازہ ترین تصنیف ہے۔ جسے نوجوانوں خصوصاً کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور معلّمین میں زیادہ پسند کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مواد کالج ہی کی رنگین فضا سے متعلق ہے۔

مضمون طویل ہو رہا ہے اس لیے پشتو کی دیگر تصانیف خصوصاً خالص مذہبی کتب اور تحریروں کی تفصیل کو چھوڑتے ہوئے فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پشتو زبان کو اسلامی تعلیمات سے گہری وابستگی کا خصوصی فخر حاصل ہے اور اس ضمن میں بہت کچھ پہلے بھی لکھا گیا ہے اور لکھا بھی جا رہا ہے۔ پشتون علماء کی معقول تعداد موجود ہے جو اپنی فکری بلندی اور علمی وسعت کے سبب اس دور کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔

وہ اپنی عالمانہ تحریروں سے پشتونوں کو اسلام کی حقانیت اور تعلیمات سے بہرہ ور کرنے میں مصروف
شعر و سخن کا ملکہ رکھنے والے علماء بھی موجود ہیں اور پشتو ملکہ اردو نثر میں بھی متعدد موضوعات پر خامہ فرسائی
تے ہیں۔

روشن مستقبل

گزشتہ کئی سال سے پشاور یونیورسٹی نے ایم۔ اے پشتو کی ڈگری کا اہتمام کیا ہے۔ اس کا نصاب
متنوع اور بلند پایہ ہے۔ اس میں پشتو کی قدیم و جدید ادبیات کے علاوہ خوش حال خان خٹک اور علامہ اقبال کے
کلام کے مطالعہ پر خاصا زور دیا جاتا ہے حتیٰ کہ ایم۔ اے پشتو کا ایک مضمون ہی خوش حال خان اور اقبال کا
مطالعہ ہے اور ان پر ایک پرچہ بھی امتحان میں شامل ہے پشتو ادبیات کے ضمن میں اب تک کافی کام ہو چکا
ہے لیکن اس کی تکمیل و دریافت ابھی باقی ہے۔ اس میدان میں تحقیق اور تنقید کی بہت گنجائش ہے۔ ہر سال چالیس
پچاس نوجوان پشتو ایم۔ اے کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس کے نتیجے میں پشتو ادب کی تحقیق، تنقید اور تخلیق کا
میدان وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ اس وقت بھی پشتو ادب کے اچھے محققین اور ناقدین موجود ہیں اور
یہ شوق بڑھتا جا رہا ہے اس لیے پشتو میں پی ایچ ڈی کے امکانات روشن ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ خوش حال
خان خٹک کے اس چیلنج کا جواب دینے والے پیدا ہو جائیں جو اس نے تین سو سال پہلے یوں دیا تھا:

"پشتو ابھی باکرہ ہے۔ اس کے چہرے پر سے کسی نے نقاب نہیں اٹھائی ہے۔"

سیاستِ شرعیہ

از مولانا رئیس احمد جعفری

اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے ایک دستورِ حیات پیش کیا تھا جو منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ سیاستِ
شرعیہ میں قرآن، حدیث، آثار اور روایاتِ صحیحہ کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔

قیمت ۵ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور

جناب احمد ندیم قاسمی

فنونِ لطیفہ

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بیس برس بعد بھی ہم پاکستانی تہذیب، پاکستانی ثقافت، پاکستانی کلچر کی کوئی ایسی صورت متعین نہیں کر سکے جس پر دانش وروں اور دانش مندوں کی اکثریت متفق ہو۔ پاکستان یقیناً ایک نظریاتی مملکت ہے مگر جو نظریہ اس مملکت کی اساس قرار پایا ہے جیسی وسیع المشربی اور بے تعصبی اور انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ یہ مسائلِ حیات میں حسن و توازن برتنے کا نظریہ ہے۔ یہ ایک ایسے معیاری عدل کا نظریہ ہے جس میں امتیازی سلوک کی شق نابید ہے۔ اس صورت میں ہماری تہذیب و ثقافت کی صورت پذیری میں اتنی تاخیر نہیں ہونی چاہیے تھی کہ بیس برس کی آزادی اور خود مختاری کے بعد بھی اگر ہم ملک کے ایک سو معروف دانش وروں کو جمع کر کے ان سے پاکستانی تہذیب و ثقافت کا مفہوم پوچھیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی کسی دوسرے سے متفق نہیں ملے گا۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ افہام و تفہیم کی عالمانہ فضا کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہر شخص نے اپنے نظریات پر رنگ و آہن کے خول چڑھا رکھے ہیں اور بحث و تمحیص کی محفلوں میں ہم اس لیے جمع نہیں ہوتے کہ اپنا نقطۂ نظر دوسروں کو سمجھائیں اور دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کریں، بلکہ یہ محفلیں بالعموم ذہنی دنگل ہوتی ہیں جہاں زور آزمائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی بھی مہذب قوم کے لیے یہ صورتِ حال بے انتہا تشویش ناک ہے۔ اس طرح تہذیب میں جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ روشنی اور دھوپ اور تازہ ہوا سے محروم ہو جاتی ہے اور ذہنی طور پر مریض نسلیں پیدا ہونے لگتی ہیں جو اپنی تہذیب و ثقافت کی کسی معین اور واضح صورت کی غیر موجودگی میں احساسِ کمتری کا شکار رہتی ہیں، اور یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے "برتری" کا مضحکہ خیز انداز اختیار کیا جاتا ہے، وہ خود اعتمادی سے محروم ہوتی ہیں اور ان کے قدموں تلے زمین نہیں ہوتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس عالم میں تہذیبوں کی سانسیں اکھڑ جاتی ہیں اور قوموں کی انفرادیتوں کو گھن لگ جاتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم ایسی خوف ناک صورتِ حال

سے دوچار ہوں، مگر ہمیں کھلے دل کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے ہم بحیثیت ایک قوم، شدید تساہل اور خود فریبی کے شکار ہیں۔ اعتراف وہی کرتا ہے جس کا احساس بیدار ہوتا ہے اور احساس بیدار ہو تو تلافی ممکن ہے۔ اس کے بغیر ہم صرف نعرے لگاتے رہ جائیں گے اور نعرہ عموماً صرف حلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی ایک آدھ جڑ بھی دل اور دماغ کو نہیں چھو پاتی۔

تہذیب و ثقافت کے انتشار کے دور میں فنونِ لطیفہ بھی انتشار کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ دراصل فنون تو متعلقہ تہذیب کا اظہار ہوتے ہیں۔ وہ نہ ہوا میں پیدا ہوتے ہیں نہ خلا میں۔ ان کی جڑیں ہمیشہ دھرتی میں ہوتی ہیں اور جب دھرتی ہی شور ہو تو فنون کا پنپنا معلوم! میں یہ نہیں کہتا کہ فنون ہمیشہ تہذیب و ثقافت کی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ بعض حالات میں فن کار تاریخ سازی اور تہذیب آفرینی کا کام بھی کرتے ہیں مگر اس عظیم کام کے لیے عظیم فن کاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ معمول کے حالات میں فنون، تہذیب و ثقافت کے مروجہ معیاروں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے جس گومگو کے عالم میں اب تک گرفتار ہیں، وہی عالم ہمارے فنونِ لطیفہ پر بھی مسلط رہا ہے۔ حوصلہ افزا پہلو صرف یہ ہے کہ ہمارے فنون نے عام روش سے اثر پذیری کے باوجود اپنی وہ خصوصیت ابھی تک نہیں کھوئی جسے تخلیقی کرب اور تخلیقی تجسس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے فنونِ لطیفہ میں وہ کرب، وہ کرید، وہ تجسس ابھی تک موجود ہے، اور اگر ہماری تہذیب و ثقافت کی صورت پذیری میں مزید تاخیر نہ برتی گئی تو فنون کے سلسلے میں تخلیق کی اس لگن کو بہت بڑا سہارا میسر آجائے گا۔ آج کا فن کار اپنے ماحول اور اپنی فضا سے باقاعدہ متصادم ہو کر فن تخلیق کرتا ہے۔ کل جب اس کا آدرش اپنی ہی منفرد تہذیب سے قوت حاصل کرنے لگے گا تو ہمارے فنون میں سے بھی انتشار اور بے یقینی کی کیفیت غائب ہو جائے گی۔

فنونِ لطیفہ

فنونِ لطیفہ میں شعر و ادب، مصوری، موسیقی، تعمیر، رقص، سنگ تراشی بلکہ اب فلم اور فوٹوگرافی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ فلم اور فوٹوگرافی کے فنون ہمارے ہاں ابھی گھٹنیوں چل رہے ہیں اور سنگ تراشی کا رواج ہی نہیں ہے اس لیے یہاں ان کا ذکر بے کار ہوگا۔ رہا رقص تو وہ ابھی تک مختلف علاقوں